حصۂ نظم

- شاعر کا تعارف
- نظم کا تعارف
- اشعار کی تشریح
- مشق
- اضافی مختصر سوال جواب
- اضافی کثیر الانتخابی سوالات

Geniusnesthub.com

CamScanner

جوابِ شکوہ

علامہ اقبال

(1877ء-1938ء)

تعارف:

زندگی کے حالات: شیخ محمد اقبالؒ سیالکوٹ کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ روایات کے مطابق اقبالؒ کی ابتدائی تعلیم دینی مدرسے میں ہوئی۔ انگریزی سکول سے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا ورمرے کالج میں داخل ہو گئے۔ یہاں اُنھیں مولوی سید میر حسن جیسا اُستاد میسر آیا۔ اقبال کو فارسی اور عربی کا صحیح ذوق اُنھیں کی بدولت حاصل ہوا۔ ایف۔ اے کرنے کے بعد وہ گورنمنٹ کالج لاہور چلے گئے۔ وہاں بھی اُنھیں پروفیسر آرنلڈ جیسا شفیق اُستاد ملا۔ جن کی وجہ سے اقبال کی خُفیہ صلاحتیں بیدا ہو گئیں۔ اسی کالج سے ایم اے کرنے کے بعد اُنھوں نے کچھ عرصہ یہاں تدریس کے فرائض انجام دیے، پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے اور وہاں بیرسٹری اور فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کیا۔ واپس آنے کے بعد انھوں نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ مگر اس پیشے سے طبیعت جلد اُچاٹ ہو گئی۔ علامہ اقبالؒ نے کچھ عرصہ سیاست میں بھی دلچسپی لی۔ ایک مرتبہ جب مسلم لیگ کی صدارت کے لیے اُن کا نام تجویز ہوا، تو اُنھوں نے اپنی بجائے قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کو اس منصب کا اہل قرار دیا۔ علامہ اقبال کا ایک اہم کارنامہ ۱۹۳۰ء میں الہٰ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ جلسے میں قیامِ پاکستان کی تجویز ہے۔ آخری عمر میں مختلف بیماریوں نے آن گھیرا اور وہ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ کو خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

شاعرانہ خدمات: اقبالؒ وہ ہستی ہیں، جن پر نہ صرف ایشیا بلکہ پوری دُنیا فخر کرتی ہے۔ اُنھوں نے شاعری کا آغاز تو سکول کے زمانے سے ہی کیا تھا، لیکن دورۂ یورپ کے بعد صحیح معنوں میں اُن کے موضوعات کا تعین ہو گیا۔ اُنھوں نے تاریخِ عالم کا مطالعہ کیا تھا، اس لیے وہ مسلمانوں کے زوال کے اسباب سے آگاہ تھے۔ اُنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے حرکت و عمل کا پیغام دیا۔ اُن کا فلسفۂ خودی اور تصورِ مردِ مومن مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ بن گیا۔ اُردو کے روایتی شعرا کے برعکس اقبالؒ نے اُردو شاعری کو نئے موضوع، خیالات، اسلوب اور فلسفیانہ خیالات سے روشناس کرایا۔ اُن کا مشاہدہ بے حد قوی تھا۔

شاعرانہ عظمت: منظر نگاری پر اُنھیں عبور حاصل تھا۔ غرض اقبالؒ کی شاعری روایت اور جدت کا بہترین امتزاج ہے۔ اپنی بے پناہ شاعرانہ خصوصیات کے باعث اُنھیں شاعرِ مشرق، حکیم الامت، اور نباضِ فطرت کہا جاتا ہے۔ اقبالؒ کو عربی اور فارسی زبانوں پر عبور حاصل تھا اُنھوں نے اپنے کلام میں قرآنی آیات کا استعمال بڑی خوب صورتی سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ اُن کے کلام کا ایک بڑا حصہ فارسی زبان پر مشتمل ہے۔ اقبالؒ کے آفاقی نظریات زیادہ تر اُن کے فارسی کلام میں موجود ہیں۔

تصانیف: بانگِ دار، بالِ جبریل، ضربِ کلیم، ارمغان حجاز، زبورِ عجم، جاوید نامہ، اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق، مسافر، پیامِ مشرق، علم الاقتصاد (نثر) وغیرہ۔

Geniusnesthub.com

CS CamScanner

نظم کا تعارف:

یہ نظم اقبال کی شہرہ آفاق نظم ''جوابِ شکوہ'' سے لی گئی ہے۔ یہ مسدس کی ہیئت میں ہے جس کے ہر بند میں چھ مصرعے ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے 1911ء میں علامہ اقبال نے اپنی شہرہ آفاق نظم ''شکوہ'' لکھی تھی۔ جس میں مسلمانوں کی گذشتہ شان وشوکت بیان کرنے کے بعد ان کے زوال کا ذکر بڑے کرب سے کیا تھا۔ اس میں اقبال نے مسلمانوں کے زوال پر ان کی زبانی اللہ سے شکوہ کیا تھا۔ پھر 1913ء میں اقبال نے ''جوابِ شکوہ'' لکھی۔ یہ پہلی نظم کا جواب تھی۔ جس میں اللہ کی طرف سے مسلمانوں کے زوال کے اصل اسباب اور ان کا حل بیان کیا گیا تھے۔

(تعارفی عبارت ہر جزو کی تشریح سے پہلے لکھی جاسکتی ہے)

لغت و توضیحات

تعارف (صفحہ نمبر 187)

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
منصب	مقام، عہدہ	نباضِ فطرت	فطرت کو سمجھنے والا
تصورِ مردِ مومن	اقبال کی شاعری میں مومن کا تصور	اسلوب	انداز
روشناس	متعارف کروانا	امتزاج	ہم آہنگ ہونا
حکیم الامت	اقبال کا لقب		
آفاقی نظریات	ایسے نظریات جن کا تعلق کسی خاص جگہ یا خاص زمانے سے نہیں بلکہ پوری دنیا اور تمام زمانوں سے ہو		
فلسفۂ خودی	اقبال کا خاص اسلامی فلسفہ، جس کا بنیادی موضوع اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی سے گزر کر خودی یعنی شخصیت کی انتہائی بلندی پر پہنچنا ہے		

اشعار کی تشریح

(۱)

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے
قدسی الاصل ہے، رِفعت پہ نظر رکھتی ہے
خاک سے اُٹھتی ہے، گردوں پہ گزر رکھتی ہے
عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا
آسماں چیر گیا نالۂ بیباک مرا

لغت: طاقتِ پرواز: اُڑنے کی طاقت۔ قدسی الاصل: پاکیزہ۔ رفعت: بلندی۔ گردوں: آسمان۔ فتنہ گر: فتنہ پیدا کرنے والا، امراد شوخ۔ سرکش: نافرمان، نہ رکنے والا۔ نالۂ بیباک: بےخوف شکایت یا فریاد۔

مفہوم: جو بات دل سے نکلے، اس میں تاثیر ضرور ہوتی ہے۔ اس کی منزل آسمان کی بلندیاں ہیں۔ میرا عشق بے باک تھا، اس لیے میری بے خوف فریاد آسمان تک پہنچ گئی ہے۔

Geniusnesthub.com

CS CamScanner

یہ نظم اقبال کی شہرہ آفاق نظم ''جوابِ شکوہ'' سے لی گئی ہے۔ یہ مسدس کی ہیئت میں ہے جس کے ہر بند میں چھ مصرعے ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے 1911ء میں علامہ اقبال نے اپنی شہرہ آفاق نظم ''شکوہ'' لکھی تھی۔ جس میں مسلمانوں کی گذشتہ شان وشوکت بیان کرنے کے بعد ان کے زوال کا ذکر بڑے کرب سے کیا تھا۔ اس میں اقبال نے مسلمانوں کے زوال پر ان کی زبانی اللہ سے شکوہ کیا تھا۔ پھر 1913ء میں اقبال نے ''جوابِ شکوہ'' لکھی۔ یہ پہلی نظم کا جواب تھی۔ جس میں اللہ کی طرف سے مسلمانوں کے زوال کے اصل اسباب اور ان کا حل بیان کیا گیا تھے۔

(تعارفی عبارت ہر جز وکی تشریح سے پہلے لکھی جا سکتی ہے)

نظر بند میں شاعر اس بات کی اہمیت بیان کر رہا ہے جو دل سے نکلتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ انسان ایک دوسرے سے کلام کرتے ہیں۔ وہ اپنی بات کو موثر بنانے کے لیے اسے کئی طرح سے خوب صورت بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ کبھی اس میں جذبات کا رنگ شامل کرتے ہیں تو کبھی اسے منطقی دلائل سے مزین کرتے ہیں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ صرف وہی بات اثر رکھتی ہے جو دل سے نکلی ہو۔ جس میں اخلاص اور سچائی شامل ہو۔ اسی لیے غالب نے کہا تھا:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا　　　میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

جب انسان سچائی کو پورے اخلاص سے بیان کرتا ہے تو اس میں وہ تاثیر پیدا ہو جاتی ہے جو پتھر کو بھی موم کر سکتی ہے۔ وہ پر نہیں رکھتی لیکن اس میں اُڑنے کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ آسمانوں تک پرواز کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ایسی بات فرشتوں کی طرح پاکیزہ ہوتی ہے جن کا مسکن ہی آسمان ہے۔ دل سے نکلی ہوئی بات زمین سے آسمان تک کا سفر کرتی ہے۔ وہ ہمیشہ بلندیوں کی مسافر رہتی ہے۔ اس میں ایسی دل نشینی ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کے دل میں اُتر جاتی ہے۔ وہ ان میں پاکیزگی اور بلندی کا تصور پیدا کرتی ہے۔ وہ انھیں پستی سے بلندی کا مسافر بنا دیتی ہے۔ بقول اکبر الہ آبادی:

آہ جو دل سے نکالی جائے گی　　　کیا سمجھتے ہو کہ خالی جائے گی

اسی لیے شاعر اپنے عشق کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ ایسا شوخ اور سرکش ہے کہ ہر رکاوٹ سے گزر جاتا ہے۔ وہ شاعر کے دل میں ایسے تڑپ پیدا کرتا ہے جو اس کے دل سے نکلی ہوئی بات کو پُر تاثیر بنا دیتا ہے۔ اس لیے اس کی فریاد میں وہ طاقت تھی کہ وہ آسمان چیر گئی ہے۔

(۲)

پیرِ گردوں نے کہا سن کے، کہیں ہے کوئی!　　　بولے سیارے، سرِ عرشِ بریں ہے کوئی!
چاند کہتا تھا، نہیں، اہلِ زمیں ہے کوئی!　　　کہکشاں کہتی تھی، پوشیدہ یہیں ہے کوئی
کچھ جو سمجھا مرے شکوے کو تو رضواں سمجھا
مجھے جنت سے نکالا ہوا انساں سمجھا

لغت: پیرِ گردوں: بوڑھا آسمان۔ سرِ عرشِ بریں: آسمان کے عرش کے اوپر۔ کہکشاں: ستاروں کا جھرمٹ۔ پوشیدہ: چھپا ہوا۔ رضوان: جنت کا داروغہ یا نگران۔

مفہوم: میری فریاد سن کر آسمان، سیارے، چاند اور کہکشاں میرے بارے میں اندازہ لگانے لگے لیکن میری فریاد سن کر جنت کا نگران سمجھ گیا کہ یہ جنت سے نکالا ہوا انسان ہے۔

Geniusnesthub.com

CS CamScanner

تشریح

(تعارفی عبارت ہر جز کی تشریح سے پہلے لکھی جاسکتی ہے)

زیرِ نظر بند میں شاعر اپنی دل سے نکلی ہوئی بے باک فریاد سے پیدا ہونے والی ہلچل کے بارے میں بیان کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب اس کے ہنگامہ خیز عشق نے شکوہ کی صورت اختیار کی تو اس نے پورے نظامِ کائنات میں ایک ہلچل مچادی۔ ہر کوئی اس درد بھری آواز کے بارے میں گفتگو کرنے لگا۔ ہر کوئی اندازے لگانے لگا کہ یہ کون ہوسکتا ہے۔

سب سے پہلے وہ بوڑھے آسمان کے بارے میں بتاتا ہے کہ جب اس نے شاعر کا غم انگیز نالہ سنا تو وہ یہی سمجھا کہ یہ آواز اس کے قریب سے آئی ہے۔ پھر سیارے آپس میں بات چیت کرنے لگے۔ وہ ایک دوسرے کو بتانے لگے کہ یہ کوئی ضرور آسمان کے عرش کے اوپر اپنی فریاد بیان کر رہا ہے۔ لیکن چاند نے ان کی تصحیح کی کہ یہ اہلِ آسمان میں سے نہیں ہے بلکہ یہ آواز زمین سے آئی ہے۔ حتیٰ کہ کہکشائیں بھی یہی سمجھیں کہ یہ کوئی انھیں میں چھپا ہوا ہے۔ الغرض کہ ہر کوئی اس غم انگیز فریاد کو سن کر متاثر ہوا۔ اور اس کے بارے میں بات کرنے لگا۔ گویا اس میں ایسی تاثیر پیدا ہوگئی تھی کہ بقول جلیل مانک پوری:

مری آہ کا تم اثر دیکھ لینا — وہ آئیں گے تھامے جگر دیکھ لینا

لیکن شاعر کہتا ہے کہ اس شکوہ اور فریاد کو سن کر صرف جنت کے نگران نے ٹھیک اندازہ لگایا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ وہ آدم زاد ہے جسے اس کی نافرمانی کی وجہ سے جنت سے نکالا گیا تھا۔ ایسا درد اور غم کی شدت صرف اسی کی فریاد میں ہوسکتی ہے۔ کیوں کہ انسان ہی وہ مخلوق ہے جو اپنے اصل گھر سے بے گھر ہے۔ جو اپنے وطن سے نکالا ہوا ہے اور پردیس کی تکلیف کاٹ رہا ہے۔ ایسے ہی دکھ اور کرب کو راہی معصوم رضا نے بیان کرتے ہوئے، اپنے گھر کو کچھ یوں یاد کیا ہے:

جن سے ہم چھوٹ گئے، اب وہ جہاں کیسے ہیں — شاخِ گل کیسی ہے، خوشبو کے مکاں کیسے ہیں

(۳)

تھی فرشتوں کو بھی حیرت کہ یہ آواز ہے کیا! — عرش والوں پہ بھی کھلتا نہیں یہ راز ہے کیا!
تا سرِ عرش بھی انساں کی تگ و تاز ہے کیا؟ — آگئی خاک کی چٹکی کو بھی پرواز ہے کیا!
غافل آداب سے سکّانِ زمیں کیسے ہیں!
شوخ و گستاخ یہ بستی کے مکیں کیسے ہیں!

لغت: تگ و تاز: کوشش، پہنچ، رسائی۔ خاک کی چٹکی: مراد انسان۔ سکّانِ زمیں: زمین کے انسان۔ مکیں: رہنے والے۔

مفہوم: فرشتوں اور آسمان والے بھی اس آواز کو سن کر حیرت میں تھے اور سوچ رہے تھے کہ کیا انسان کی پہنچ عرش تک ہے؟ اور یہ زمین کے رہنے والے آداب سے خالی اور گستاخ کیسے ہوگئے ہیں۔

تشریح

(تعارفی عبارت ہر جز کی تشریح سے پہلے لکھی جاسکتی ہے)

زیرِ نظر بند میں شاعر اپنی غم انگیز فریاد کے بعد جو ہلچل پیدا ہوئی، اس کا نقشہ کھینچ رہا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ اس کی دردناک فریاد سن کر فرشتے

Geniusnesthub.com

CamScanner

بھی حیرت سے کہنے لگے کہ یہ آواز کیسی ہے۔ انھیں اندازہ نہیں ہو سکا کہ یہ کون ہے جو اتنے درد بھرے انداز میں شکوہ کر رہا ہے۔ عرش کے فرشتے جو ایسی باتوں سے ویسے ہی بے نیاز ہیں۔ اور ہر وقت اللہ کی تسبیح میں معروف رہتے ہیں۔ وہ بھی نہ سمجھ سکے کہ یہ کس کے دل کی صدا ہے۔ اور وہ آپس میں چہ مگوئیاں کرنے لگے کہ کیا کسی انسان میں اتنی ہمت اور طاقت ہو سکتی ہے کہ وہ یا اس کی فریاد آسمانوں کو چیر کے گزر آئے۔ اسی حیرت کا جواب اقبال نے اپنے ایک اور شعر میں کچھ یوں دیا تھا:

عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام　　　اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

(جست: چھلانگ۔ طے کر دیا قصہ تمام: سفر مکمل کر دیا۔ بے کراں: لامحدود)

پھر شاعر فرشتوں کی مزید حیرت کو نمایاں کرتا ہے۔ فرشتے حیرت سے ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں۔ کہ کیا یہ وہی انسان ہے جسے اللہ تعالی نے مٹی سے پیدا کیا تھا اور اُڑنے کی طاقت نہیں دی تھی۔ وہ اس بات پر حیران ہیں کہ آج اس میں اتنی طاقت کیسے آ گئی ہے کہ وہ پرواز بھی کرنے لگا ہے۔ اور پھر چوں کہ آسمان والے تو اللہ کے حضور عرض اور گزارش کرنے کے آداب جانتے تھے۔ اس لیے وہ اس شوخ فریاد کو ادب آداب کے خلاف تصور کر رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ زمین کے رہنے والے نے جو انداز اختیار کیا ہے، وہ ایک گستاخانہ انداز ہے۔ اس لیے ان کی حیرت میں ایک خوف کا عنصر بھی شامل تھا۔ کہ خدا جانے اس گستاخی اور شوخی کا کیا نتیجہ نکلے گا۔

(۴)

اس قدر شوخ کہ اللہ سے بھی برہم ہے　　　تھا جو مسجودِ ملائک، یہ وہی آدم ہے
عالمِ کیف ہے، دانائے رموزِ کم ہے　　　ہاں، مگر عجز کے اَسرار سے نا محرم ہے
ناز ہے طاقتِ گفتار پہ انسانوں کو
بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

لغت: برہم: ناراض۔ مسجودِ ملائک: جسے فرشتوں نے سجدہ کیا۔ عالمِ کیف: سرور و مستی کی حالت۔ دانائے رموزِ کم: چھپی ہوئی باتوں کو کم جاننے والا۔ عجز کے اَسرار: عاجزی کے راز۔ نامحرم: ناواقف۔ طاقتِ گفتار: بولنے کی طاقت۔

مفہوم: فرشتے انسان پر حیرت کرنے لگے کہ یہ تو اللہ سے بھی ناراض ہے۔ جسے کبھی فرشتوں نے سجدہ کیا تھا۔ لیکن اپنی محدودیت کے باوجود عاجزی سے ناواقف ہے۔ اگرچہ اسے اپنے بولنے پر بڑا ناز ہے لیکن بات کرنے کا سلیقہ نہیں ہے۔

تشریح

(یہ تعارفی عبارت ہر جزو کی تشریح سے پہلے لکھی جا سکتی ہے)

زیرِ نظر اقتباس میں شاعر فرشتوں کی انسان کے بارے میں ہونے والی گفتگو بیان کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب اس کی شوخ فریاد آسمانوں کو چیرتے ہوئے عرش تک پہنچ گئی تو نظام کائنات میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ ہر کوئی اس کے بارے میں گفتگو کرنے لگا۔ فرشتے بھی حیرت اور خوف کے ساتھ اس گستاخی پر تبصرے کرنے لگے۔ انھوں نے حیرانی سے کہا کہ یہ کیسی مخلوق ہے جو اپنے خالق سے بھی ناراض دکھائی دیتی ہے۔ حالانکہ اللہ نے اسے پیدا کیا ہے۔ اسے بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔ لیکن آج اس کی درد انگیز فریاد میں شکوہ کا رنگ موجود ہے۔

پھر فرشتوں نے یاد کیا کہ یہ وہی ہے جسے ان سے سجدہ کروایا گیا تھا۔ یہ وہی ہے جسے جب تخلیق کیا جا رہا تھا تو فرشتوں نے اللہ کے حضور

Geniusesthub.com

CamScanner

عرض کی تھی کہ کیا وہ اس کی تسبیح کرنے کے لیے کافی نہیں۔ تو اللہ نے کہا تھا کہ جو وہ جانتا ہے، فرشتے نہیں جانتے ہیں۔ اللہ نے واضح کیا کہ وہ اس مخلوق کو زمین پر اپنا خلیفہ اور نائب بنائے گا۔ جو اس کی طرف سے دیے گئے اختیار اور قدرت کے ساتھ زندگی گزارے گا۔ اور یہی اس کا امتحان ہوگا۔ اور پھر بعد میں اللہ نے اسے علم عطا کیا اور فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ اب اسے سجدہ کریں۔

"اور یاد کرو! جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو۔" (البقرہ:34)

پھر فرشتے اس کے بارے میں گفتگو کرنے لگے کہ اسے علم تو دیا گیا ہے لیکن محدود نوعیت کا۔ یہ کائنات کے بہت ہی کم رازوں سے واقف ہے۔ لیکن پھر بھی اس میں عاجزی نہیں ہے۔ بلکہ یہ جو تھوڑا سا علم دیا گیا ہے، اسی پر مغرور ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ اسے بیان کرنے کی قوت پر بڑا ناز ہے۔ لیکن یہ بھول گیا ہے کہ اللہ ہی نے اسے بولنا سکھایا ہے۔ اسے زبان عطا کی۔ جو اس کی نشانیوں میں سے ہے۔ اس لیے فرشتوں کے خیال میں انسان کم ظرف ہے کہ اپنے مالک کے عطا کی ہوئی نعمتوں کو بھول گیا اور نادانی کی باتیں کرنے لگا۔

"بے شک انسان ظالم اور ناشکرا ہے۔" (الابراہیم:34)

(۵)

آئی آواز غم انگیز ہے افسانہ ترا — اشکِ بیتاب سے لبریز ہے پیمانہ ترا
آسماں گیر ہوا نعرۂ مستانہ ترا — کس قدر شوخ زباں ہے دل دیوانہ ترا
شکر شکوے کو کیا حسنِ ادا سے تو نے
ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے

لغت: غم انگیز: دکھ بھرا۔ اشکِ بیتاب: بے چین آنسو، چھلک جانے کے لیے بے چین۔ آسماں گیر ہوا: آسمان پر چھا گیا ہے۔ نعرۂ مستانہ: پرجوش فریاد۔ حسنِ ادا: اچھے طریقے سے۔ ہم سخن: باہم بات چیت کرنے والے۔

مفہوم: یہ سن کر اللہ کی طرف سے جواب آیا کہ تمھاری فریاد بہت ہی دردناک ہے اور پورے آسمان پر اس کے بارے میں بات ہو رہی ہے۔ اگرچہ تیرا دل شوخ ہے لیکن تو نے اپنا شکوہ اچھے انداز میں پیش کیا ہے اور تو نے اس کے ذریعے خدا کو بندو سے ہم کلام کر دیا ہے۔

تشریح

(تعارفی عبارت ہر جزو کی تشریح سے پہلے لکھی جاسکتی ہے)

زیرِ نظر بند میں شاعر اپنے غم انگیز شکوہ کے جواب میں اللہ کی طرف سے جواب دینا شروع کرتا ہے۔ اس بند سے اللہ کی طرف سے بندوں سے خطاب شروع ہوتا ہے۔ یہ ایک شاعرانہ انداز ہے جس میں شاعر فرضی طور پر کسی کی طرف سے جواب دیتا ہے۔ اب جو اللہ نے شاعر کا شکوہ اور نالہ سنا تو اس سے مخاطب ہو کر کہا کہ شاعر کی فریاد بہت ہی غم سے لبریز ہے۔ اس کی تاثیر بتاتی ہے کہ یہ صدا دل سے نکلی ہوئی ہے۔ اس میں ان آنسوؤں کی نمی بھی ہے جو شاعر نے رات کی تاریکیوں میں بہائے ہیں۔ یہ وہ بے تابی ہے جو شاعر اپنے دل میں امتِ مرحوم کے لیے محسوس کرتا ہے۔ یہ وہ کرب ہے جو شاعر کے دل میں امت کی حالت دیکھ کر پیدا ہوتا ہے۔ یہ وہ دعا ہے جو دل سے نکلتی ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے بھی امت کی اسی حالت کو دیکھ کر بڑے دکھ کا اظہار کیا تھا:

وہ دین کہ بڑی شان سے نکلا تھا، وطن سے
پردیس میں وہ آج، غریب الغربا ہے

Geniusneshub.com

CamScanner

پھر شاعر اللہ ہی کی زبانی یوں گویا ہوتا ہے کہ تیری پر جوش فریاد اس وقت آسمان پر چھائی ہوئی ہے۔ ہر طرف یہی دردناک صدا موضوع گفتگو ہے۔ ہر کوئی اسی کے بارے میں اندازے لگا رہا ہے۔ اسی لیے وہ فرماتا ہے کہ شاعر کے دیوانے دل سے نکلنے والی صدا بہت ہی شوخ ہے۔ یہ انداز خوب صورت بھی ہے۔ ایسا خوب صورت کہ شکوے کو بھی شکر بنا دیا ہے۔ اب یہ کوئی بے ادبی اور گستاخی محسوس نہیں ہو رہا۔ بلکہ یہ ایک درد دل رکھنے والے انسان کی پکار محسوس ہو رہا ہے۔ جو درد سے لبریز ہونے کے بعد فریاد بن گیا ہے۔ یہ خالق کے حضور بے ادبی نہیں ہے بلکہ یہ ایک عاجز بندے کی وہ پکار ہے جو وہ بے بسی میں دیتا ہے۔ اسی لیے اقبال نے شکوہ میں کہا تھا:

اے خدا! شکوہ ارباب وفا بھی سن لے　　خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلا بھی سن لے

وہ شاعر کو داد دیتا ہے کہ اس کے اس شوخ انداز نے خالق کو بھی بندوں سے ہم کلام کر دیا ہے۔ اور وہ اس کی فریاد کا جواب دے رہا ہے۔ اس بند سے پھر جو اللہ کا خطاب شروع ہوتا ہے، وہ نظم کے آخر تک چلتا ہے۔ اس خطاب میں شاعر نے اللہ کی طرف امت کے زوال کے اسباب گنوائے ہیں۔ یہ مرض کی وہ تشخیص تھی جو اس کا علاج کرنے سے پہلے ضروری ہوتی ہے۔

(٦)

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں　　راہ دکھلائیں کسے؟ رہروِ منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے، جوہرِ قابل ہی نہیں　　جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گِل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

لغت: مائل بہ کرم: مہربانی کرنے کے لیے تیار۔ سائل: سوال، دعا کرنے والا۔ رہروِ منزل: منزل کی طرف جانے والا مسافر۔ جوہرِ قابل: اہلیت رکھنے والا۔ گِل: مٹی۔ شانِ کئی: کَے جیسی شان یعنی ایران کے مشہور بادشاہ کی خسرو جیسی عظمت۔

مفہوم: ہم تو مہربانی کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن کوئی سوال کرنے والا اور اس راستے پر چلنے والا ہی نہیں۔ کوئی اس اہلیت اور صلاحیت کا آدمی ہی نہیں ہے جو آدم کا امتیاز ہے۔ اگر کوئی ہو تو ہم اسے عظمت بھی عطا کرتے ہیں اور نئی دنیاؤں سے بھی متعارف کرواتے ہیں۔

تشریح

(تعارفی عبارت ہر جزو کی تشریح سے پہلے لکھی جا سکتی ہے)

زیر نظر بند میں شاعر نے اللہ کی طرف سے خطاب کرتے ہوئے مسلمانوں کی کم ہمتی کو موضوع بنایا ہے۔ وہ شاعر کے شکوے کے جواب میں اسے ان کے زوال کی اصل وجوہات سے آگاہ کرتا ہے۔ شاعر نے "نظم شکوہ" میں مسلمانوں کی طرف سے دی جانے والی قربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا:

دشت تو دشت ہیں، دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے　　بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

اور پھر یہ شکوہ کیا تھا کہ اب اس کی کرم نوازیاں صرف غیروں کے لیے ہیں:

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر　　برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

گویا یہ مرض کا بیان تھا کہ مسلمان وہ قوم ہے جو تیرہ سو سال تک توحید کا پرچم دنیا پر لہرانے کے لیے قربانیاں دیتی رہی لیکن آج اس کا یہ

Geniusnesthub.com
CamScanner

حال ہے کہ کوئی اس کا پرسان حال بھی نہیں۔ اس کے جواب میں شاعر اللہ کی طرف سے مرض کے اصل اسباب پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اول تو یہ شکوہ ہی بے جا ہے کہ اب وہ مائل بہ کرم نہیں رہا۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ اس کی رحمتوں اور کرم نوازیوں کا دریا ابھی بھی ویسے ہی جوش مارتا ہے۔ لیکن اب یہ معاملہ آن پڑا ہے کہ ہم تو پہلے کی طرح مائل بہ کرم ہیں، اپنی رحمتیں اور کرم سے تمھیں نوازنا چاہتے ہیں لیکن آج کوئی یہ چاہتا ہی نہیں ہے۔ ہم تو راستہ دکھانے کے لیے مضطر ہیں کہ کوئی آئے اور ہم اسے سیدھا راستہ دکھائیں، اسے صراط مستقیم پر مضبوطی سے جمادیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی غفلت کا یہ حال ہے کہ کوئی سیدھے راستے کا طالب ہی نہیں ہے۔ کوئی منزل پر پہنچنا ہی نہیں چاہتا ہے۔ ہر کوئی دنیا کی محبت میں اس قدر غرق ہے کہ اسے کچھ ہوش ہی نہیں ہے۔ یہ وہی مسلمان ہیں جنھیں ''بہترین امت'' اور ''آخری امت'' کا منصب اور اعزاز دیا گیا تھا۔ لیکن آج ان میں صلاحیت اور قابلیت نام کی کوئی چیز ہی موجود نہیں ہے۔

یہاں اقبال اللہ کی طرف سے جواب دیتے ہوئے یہ تلخ حقیقت بیان کرتے ہیں کہ آدم جسے زمین پر اللہ کا نائب اور خلیفہ بنا کر بھیجا گیا تھا، آج کا مسلمان اس مقام کا اہل ہی نہیں ہے۔ یہ وہ مٹی ہی نہیں ہے جس میں اعلیٰ اوصاف اور کمالات نظر آئیں۔ پھر اللہ واضح طور پر انعام کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر کوئی قوم قابلیت اور صلاحیت رکھنے والی ہو، اس کے دل میں ہدایت کی تڑپ ہو، وہ سیدھے راستے پر چلنا چاہتی ہو تو ہم بھی اسے ویسی ہی عظمت عطا کرتے ہیں جیسے کہ ہم نے پہلے ایران کے بادشاہوں کو عطا کی تھی۔ شرط صرف یہ ہے کہ ان کے اندر تڑپ اور طلب موجود ہو، وہ آگے بڑھنا جانتے ہوں۔ اگر یہ اوصاف ان میں موجود ہوں تو ہم انھیں نئی دنیاؤں کا پتا بھی دیتے ہیں۔ انھیں نئی دنیائیں تخلیق کرنے اور تعمیر کرنے کے لیے راستہ بھی دکھاتے ہیں۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا ظفر علی خان نے کہا تھا:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی   نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

(۷)

ہاتھ بے زور ہیں، الحاد سے دل خوگر ہیں   اُمتی باعثِ رسوائی پیغمبرؐ ہیں
بت شکن اٹھ گئے، باقی جو رہے بت گر ہیں   تھا براہیمؑ پدر اور پسر آزر ہیں
باده آشام نئے، بادہ نیا، خُم بھی نئے
حرمِ کعبہ نیا، بت بھی نئے، تم بھی نئے

لغت: الحاد: اللہ کا انکار کرنا، نافرمانی، لادینیت۔ خوگر: عادی۔ اُمتی: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امتی۔ بت شکن: بتوں کو توڑنے والے۔ بت گر: بت بنانے والے۔ پدر: باپ۔ پسر: بیٹا۔ آزر: حضرت ابراہیمؑ کے باپ جو بت بنانے والے تھے۔ بادہ آشام: شراب پینے والے۔ بادہ نیا: نئی شراب۔ خُم: مٹکا، صراحی۔ حرمِ کعبہ: مسلمانوں کا مرکز۔ بت بھی نئے: مراد دنیا وغیرہ سے محبت۔

مفہوم: آج کے مسلمان کم ہمت اور دین سے دور ہو رہے ہیں۔ یہ چیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کے لیے رسوائی کا باعث ہے۔ پہلے مسلمان بت توڑنے والے تھے لیکن آج بت بنانے والے ہیں۔ گویا ان کے آباؤ اجداد ابراہیمؑ کی سنت پر چلنے والے اور یہ آزر کے پیروکار ہیں۔ گویا انھوں نے اپنے لیا نیا دین ایجاد کر لیا ہے۔

تشریح

(تعارفی عبارت ہر جز کی تشریح سے پہلے لکھی جا سکتی ہے)

زیرِ نظر بند میں شاعر مسلمانوں کا دین سے ہٹ جانے اور نئے دین کی پیروی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ یہ مسلمانوں کے زوال کی بنیادی

Geniusesthub.com

CamScanner

وجوہات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی زندگی ہی میں دین کو مکمل کر دیا تھا۔ اور اسی دین کی پیروی کو لازمی قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ جو کوئی اس سے منہ پھیرے گا، دنیا و آخرت کی ذلت اور رسوائی اس کا مقدر ہوگی۔ اقبال اللہ کی زبانی شکوہ کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ آج کے مسلمانوں نہ صرف کم ہمت ہیں بلکہ دین سے بھی دور ہو رہے ہیں۔ وہ الحاد کا شکار ہو رہے ہیں۔ جو آج کے دور میں سیکولرازم اور لبرل ازم کی آخری منزل ہے۔ جہاں پہنچ کر انسان اللہ سے انکاری ہو جاتا ہے اور اس کی اطاعت سے منہ موڑ لیتا ہے۔ اور یہی کچھ آج کے مسلمان کے ساتھ ہو رہا ہے۔ بقول اقبال:

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے   یعنی وہ صاحبِ اوصافِ حجازی نہ رہے

(مرثیہ خواں: ماتم کرتی ہیں۔ صاحبِ اوصافِ حجازی: عرب کے مسلمانوں جیسی خوبیاں رکھنے والے)

اقبال اللہ کی زبانی مزید فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی یہ روش رسول ﷺ کے دین کی رسوائی کا باعث بن رہی ہے۔ یہ وہی مسلمان ہیں جن کے آبا و اجداد بت شکن تھے اور باطل کو مٹانے والے تھے۔ یہاں بت شکن محمود غزنوی کی طرف تلمیح ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ وہ حق کو عام کرنے والے اور باطل کو صفحۂ ہستی سے نابود کرنے والے تھے۔ لیکن آج کے مسلمان بت شکن بننے کی بجائے بت بنانے والے بن چکے ہیں۔ ان کے آبا تو ابراہیمؑ کی سنت پر عمل کرنے والے تھے یعنی بتوں کو مٹانے والے لیکن یہ ابراہیمؑ کے والد آذر کے پیروکار بن چکے ہیں جو بت بنایا کرتا تھا۔ گویا آج کے مسلمانوں نے دین سے منحرف ہو کر نئے نئے راستے نکال لیے ہیں۔

آخر میں اقبال اسی بات کی وضاحت کے لیے استعاروں اور کنایوں کی زبان میں کہتے ہیں کہ آج کے مسلمانوں کا دین، حرم اور راستہ بالکل بدل چکا ہے۔ وہ جس الہامی دین کے پیروکار تھے، اس سے منہ موڑ چکے ہیں اور یہی ان کے زوال کی اصل وجہ ہے۔ کیوں کہ اسلام ہی انھیں زمین سے اُٹھا کر آسمان کی بلندیوں پر لے جانے والا اور عظمت عطا کرنے والا تھا۔ جب انھوں نے اس منہ موڑ لیا تو وہ پھر زمین پر اوندھے منہ آن گرے۔ اسی نظم کے ایک اور بند میں اقبال کہتے ہیں:

وہ زمانے میں معزز تھے، مسلماں ہو کر   اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

(تارکِ قرآں: قرآن کو ترک کر کے، منہ موڑ کے)

(۸)

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے؟   نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے؟
میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے؟   میرے قرآن کو سینے سے لگایا کس نے؟
تھے تو آبا وہ تمھارے ہی، مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو!

لغت: صفحۂ دہر: دنیا سے۔ باطل: حق کا الٹ، جو اللہ کی طرف سے نہ ہو، جھوٹا۔ منتظرِ فردا: کل کا انتظار کرنے والے

مفہوم: یہ سچ ہے کہ مسلمانوں نے اس دنیا سے باطل کو مٹا دیا اور انسانوں کو ان کی غلامی سے آزاد کروایا۔ پھر میرے کعبہ کو اپنے سجدوں سے آباد کیا۔ میرے قرآن کو سینوں سے لگایا لیکن یہ سب کچھ تو تمھارے آبا و اجداد نے کیا جب کہ تم ہاتھ پر ہاتھ رکھے دوسروں کا انتظار کر رہے ہو۔

تشریح

(تعارفی عبارت ہر جزو کی تشریح سے پہلے لکھی جا سکتی ہے)

اس بند میں اقبال اللہ تعالیٰ کی زبانی مسلمانوں کو آئینہ دکھاتے ہوئے، ان کی غفلت اور بے عملی کو نمایاں کر رہے ہیں۔ جیسا کہ اقبال

Geniusnesthub.com

CamScanner

اپنی پہلی نظم ''شکوہ'' میں اس بات کا شکوہ کیا تھا کہ یہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے دنیا کے اس بت کدے سے باطل کو مٹایا تھا اور حق کا پرچم سربلند کیا تھا۔ وہ انسانوں کو شرک اور جہالت کی غلامی سے نکال کر توحید کی روشن راہوں پر لانے والے تھے۔ یہ وہی تھے جنھوں نے کعبے کو جو بتوں کا گھر بن چکا تھا، پاک صاف کیا تھا اور اسے توحیدی سجدوں سے آباد کیا تھا۔ یہ وہی تھے جنھوں نے اللہ کے آخری پیغام قرآن کو صرف اپنے سینوں ہی سے نہیں لگایا تھا بلکہ اس پر عمل بھی کیا تھا۔

اب وہ نظم ''جوابِ شکوہ'' کے اس بند میں اللہ کی زبانی مسلمانوں کو آئینہ دکھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ سب سچ ہے لیکن یہ سب کچھ کرنے والے تو تمھارے آبا و اجداد تھے۔ یہ سب جو تم بیان کر رہے ہو، تمھارے بزرگوں نے یہ کارنامے سرانجام دیے تھے۔ انھوں نے ہی دنیا کو توحید کے نور سے منور کیا تھا لیکن سوال یہ ہے کہ تم کیا کر رہے ہو۔ تم محض ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو۔ اپنی حالت بدلنے کے لیے تیار ہی نہیں ہو۔ ہر چیز کی ابتدا اس کی سوچ یا فکر سے ہوتی ہے۔ تمھارے اندر تو یہ سوچ ہی نہیں ہے کہ تم نے اپنی حالت بدلنی ہے۔ تم انتظار کر رہے ہو کہ کوئی آئے گا اور تمھاری حالت کو بدل دے گا۔ گویا یہ خود سے زیادہ دوسروں پر بھروسا ہے کہ وہ تمھاری حالت کو بدلیں۔ تو پھر یاد رکھو کہ یہ اللہ کی سنت ہے کہ جب تک کوئی قوم اپنی حالت خود بدلنے کی کوشش نہ کرے، اللہ بھی اس کی حالت نہیں بدلتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے:

> اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا، جب تک وہ خود اس
> چیز کو نہ بدلیں جو ان کے نفوس (ذہنوں) میں ہے۔ (الرعد:۱۱)

اسی خیال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا ظفر علی خان نے اپنے مشہور شعر میں کہا تھا:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

(۹)

کیا کہا؟ بہرِ مسلماں ہے فقط وعدۂ حور
شکوہ بے جا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور
عدل ہے فاطرِ ہستی کا ازل سے دستور
مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور
تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں

لغت: بہرِ مسلماں: مسلمان کے لیے۔ حور: نہایت خوب صورت، جنت میں مومنین کی بیویاں۔ شکوہ بے جا: بے موقع جو صحیح نہ ہو۔ فاطرِ ہستی: کائنات کو پیدا کرنے والا، اللہ تعالیٰ۔ ازل: ہمیشہ سے، شروع سے۔ دستور: قانون، قاعدہ۔ مسلم آئیں ہوا: مراد اسلامی اصولوں پر چلنے والا۔ قصور: قصر کی جمع، محل۔ جلوۂ طور: مراد اللہ کا جلوہ، طور وہ پہاڑ ہے جس پر حضرت موسیٰ کو اللہ کا جلوہ دکھائی دیا۔ موسیٰ: مراد موسیٰ جیسا عشق رکھنے والا، سچا مومن۔

مفہوم: یہ شکوہ بے جا ہے کہ مسلمان سے صرف جنتوں کی نعمتوں کا وعدہ کیا گیا ہے۔ یہ اللہ کے عدل کا قانون ہے کہ جو اس کی راہ پر چلے گا وہی کامیاب ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ تم میں موسیٰ جیسا عشق رکھنے والا موجود ہی نہیں ورنہ تو منزل سامنے ہے۔

تشریح

(تعارفی عبارت ہر جز کی تشریح سے پہلے لکھی جا سکتی ہے)

اس بند میں شاعر اللہ کی زبانی ذرا سخت لہجے میں شاعر کے شکوے کا جواب دیتے ہوئے اس خیال کی نفی کر رہا ہے کہ مسلمانوں سے

Geniusesthub.com

CamScanner

صرف جنت کی نعمتوں کا وعدہ کیا گیا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا و آخرت کی کامیابی کے کچھ اصول ہیں، جو ان پر چلے گا، وہی کامیاب ہوگا۔

دراصل شاعر نے نظم "شکوہ" میں شکوہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ آج اگر کفار کو دیکھا جائے تو ان کے خزانے بھرے ہوئے ہیں۔ وہ مادی لحاظ سے ترقی کی معراج پر کھڑے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں کبھی بات کرنے کا شعور نہیں تھا، جو ان پڑھ اور جاہل تھے۔ یہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے انھیں پڑھنا لکھنا سکھایا۔ آج وہی مغربی اقوام دنیا میں آگے نکل چکی ہیں اور مسلمان ذلت کی پستیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ گویا حقیقت یہ ہے کہ کفار کو آج دنیا کی تمام نعمتیں میسر ہیں جب کہ مسلمانوں سے صرف جنت میں نعمتوں کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اسی لیے اقبال نے شکوہ کرتے ہوئے کہا تھا:

اب وہ الطاف نہیں، ہم پہ عنایات نہیں　　　بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں

(الطاف: کرم، مہربانی۔ مدارات: خاطر تواضع، مہمان نوازی)

لیکن "جوابِ شکوہ" کے اس بند میں شاعر اللہ کی زبانی اس خیال کی نفی کرتے ہوئے جواب دیتا ہے کہ یہ شکوہ کرنے سے پہلے کچھ سوچ لینا چاہیے تھا۔ یہ قدرت کا قانون ہے کہ آخرت کی طرح دنیا میں بھی ہمیشہ وہی قومیں کامیاب و کامران ہوتی ہیں جو اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلتی ہیں۔ جو محنت کا شعار اپنا لیتی ہیں۔ جو ہمت اور حوصلے کو اپنا رفیق قرار دیتی ہیں۔ یہاں دراصل شاعر اللہ کی زبانی مسلمانوں کی بے عملی پر تنقید کر رہا ہے کہ وہ بھی بنی اسرائیل کی طرح چاہتے ہیں کہ انھیں سب کچھ بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے مل جائے۔ انھیں کوئی محنت یا کوشش نہ کرنی پڑے۔ جب کہ اللہ نے ازل سے یہ قانون بنا دیا ہے کہ دنیا میں وہی قومیں سرفراز ہوں گیں جو ہمت، محنت اور لگن کو اپنے اوصاف میں ڈھالیں گیں۔ جو اپنی جدوجہد اور سخت کوشی سے اس دنیا کو خوب صورت بنائیں گیں۔ دنیا کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ وہی قومیں دنیا کے افق پر چمکی ہیں جو مسلسل جدوجہد اور محنت کا اپنا شعار بنا لیتی ہیں۔ اقبال ہی نے کہا تھا:

چلنے والے نکل گئے ہیں　　　جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

(۱۰)

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے　　　نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے　　　پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے
کشتیِ حق کا زمانے میں سہارا تو ہے
عصرِ نو رات ہے، دھندلا سا ستارا تو ہے

لغت: ایران کے مٹ جانے سے: منگولوں کے ایران پر حملے کی طرف اشارہ ہے۔ نشۂ مے: شراب کا نشہ۔ پیمانے: وہ پیالہ جس میں شراب پیتے ہیں۔ عیاں: ظاہر۔ یورشِ تاتار: منگولوں کے حملے جو چنگیز خان اور ہلاکو خان نے اسلامی دنیا پر کیے اور سب کچھ تباہ و برباد کر دیا۔ پاسباں: محافظ، اشارہ ہے منگولوں کے مسلمان ہونے کی طرف۔ صنم خانے: بت خانہ مراد منگول۔ کشتیِ حق: اسلام کی کشتی۔ عصرِ نو: نیا زمانہ۔

مفہوم: یہ یاد رکھو کہ کسی ملک کی بربادی سے تم نہیں مٹ جاؤ گے کیوں کہ پیالہ کوئی بھی ہو، شراب کا نشہ باقی رہتا ہے۔ اسی لیے منگول جو مسلمانوں کو مٹانے والے تھے، خود مسلمان ہو گئے اور اسلام کے محافظ بن گئے۔ یاد رکھو کہ تم اس زمانے میں حق کی کشتی کا سہارا ہو۔ گویا نیا زمانہ ایک رات کی طرح ہے جس میں تم دھندلے سے ستارے کی طرح ہو۔

Geniusnesthub.com
CamScanner

تشریح

(تعارفی عبارت ہر جزو کی تشریح سے پہلے لکھی جاسکتی ہے)

اس بند میں اقبال اللہ کی زبانی مسلمانوں کو نصیحت کر رہے ہیں کہ وہ شکست کھانے کے بعد بددل یا مایوس نہ ہوں بلکہ حق کا پرچم بلند کرنے کے لیے پھر سے اُٹھ کھڑے ہوں۔ زیرِ بحث بند میں شاعر نے تلمیحات استعمال کی ہیں۔ دراصل شاعر یہ سمجھتا ہے کہ جس طرح آج مسلمان ذلت اور پستی میں گرے ہوئے ہیں، تو عین ممکن ہے کہ وہ بددل یا مایوس ہو جائیں۔ وہ دل چھوڑ بیٹھیں۔ وہ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ اب اس پستی سے نکلنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اقبال ماضی کے ایک عظیم واقعے کو بطور تلمیح استعمال کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تیرویں صدی میں مسلمانوں کی بے عملی، نااتفاقی اور اسلام سے دوری کی سزا انھیں چنگیز خان کے عذاب کی صورت ملی۔ چنگیز خان جو ایک منگول سردار تھا۔ اس نے اور اس کے پوتے ہلاکو خان نے اسلامی دنیا پر وہ تباہی نازل کی کہ جس کی کوئی مثال تاریخِ عالم میں نہیں ملتی تھی۔ مسلمان جو دنیا کی امامت پر فائز تھے۔ اچانک دیمک لگے ہوئے درخت کی طرح ڈھے گئے۔ ہر طرف بربادی اور تباہی کا عالم تھا۔ اس تباہی اور بربادی کا سب سے زیادہ نشانہ عالمِ اسلام کے وہ حصے بھی بنے جو آج ایران اور عراق میں واقع ہیں۔

اسی لیے اقبال اللہ کی زبانی مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تو یہ نہ سمجھ کہ کسی ایک حصے کی تباہی سے تو ختم ہو جائے گا۔ اگر ایران، عراق وغیرہ مٹ بھی گئے تو مسلمان کسی اور خطے یا سرزمین سے ابھر آئیں گے۔ وہ کسی اور قوم کی صورت اسلام کے محافظ بن جائیں گے۔ اسی لیے اقبال کہتا ہے کہ جس طرح نشہ کو شراب کے پیالے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر ایک پیالہ ٹوٹ جائے تو شراب دوسرے پیالے میں ڈال دی جاتی ہے اور اس کا نشہ بھی باقی رہتا ہے، اسی طرح مسلمان بھی ایک جگہ شکست کھانے کے بعد دوسری طرف سے ابھر آئیں گے۔ اس کے لیے شاعر تاریخ کا وہ عظیم واقعہ بیان کرتا ہے جو منگولوں کی صورت رونما ہوا۔ منگول جو آندھی اور طوفان کی اُٹھے تھے اور امتِ مسلمہ پر عذاب کی صورت نازل ہوئے۔ چنگیز خان، اس کے بیٹے اوکتائی خان اور پھر پوتے ہلاکو خان نے اسلامی دنیا پر وہ تباہی نازل کی کہ سب کچھ خس و خاشاک کی طرح بہ گیا۔ مسلمانوں کا علمی ورثہ لائبریریاں، مدرسے، کتابیں جلا کر راکھ کر دی گئیں۔ لیکن اللہ کی قدرت دیکھیے کہ انھیں منگولوں میں سے ایک شخص برکے خان اپنی قوم سمیت مسلمان ہو گیا۔ اس کے بعد بہت سے منگول بھی اس ظلم و ستم سے تائب ہوئے اور مسلمان ہو گئے۔ پھر یہی منگول مسلمان تھے جو بعد میں اسلام کے محافظ اور اسے پھیلانے والے بن گئے۔ اسی لیے شاعر کہتا ہے کہ پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے یعنی کفر خانے سے۔ اقبال نے اپنے ایک اور شعر میں مسلمانوں کے اس گرنے اور پھر ابھرنے کو بیان کرتے ہوئے کہا تھا:

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

آخری دو مصرعوں میں شاعر مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تو اس دنیا میں حق کی کشتی کا سہارا ہے۔ یہ تو ہی ہے جس نے حق کا پرچم سربلند کرنا ہے۔ اس لیے اسے پھر سے سنبھلنا ہوگا۔ اس ذلت اور پستی سے نکلنا ہوگا۔ جب وہ یہ سمجھ لیں گے کہ وہ زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہیں، پھر وہ دوبارہ سے اپنے مقام کو حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اسی لیے اقبال اس زمانے کو سیاہ رات سے تشبیہ دیتے ہوئے مسلمانوں کو صبح کے ستارے سے تشبیہ دیتا ہے جو امید دیتا ہے کہ اگرچہ رات سیاہ اور تاریک ہے لیکن صبح بھی دور نہیں ہے۔ بقول عاطف:

رات جتنی کالی ہے صبح ہونے والی ہے

Geniusnesthub.com
CamScanner

مثلِ بو قید ہے غنچے میں، پریشاں ہو جا رخت بر دوشِ ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنک مایہ، تو ذرے سے بیاباں ہو جا نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا
قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

لغت: **ایران کے مٹ جانے سے:** منگولوں کے ایران پر حملے کی طرف اشارہ ہے۔ **نشہ مے:** شراب کا نشہ۔ **پیمانے:** وہ پیالہ جس میں شراب پیتے ہیں۔ **عیاں:** ظاہر۔ **یورشِ تاتار:** منگولوں کے حملے جو چنگیز خان اور ہلاکو خان نے اسلامی دنیا پر کیے اور سب کچھ تباہ و برباد کر دیا۔ **پاسباں:** محافظ، اشارہ ہے منگولوں کے مسلمان ہونے کی طرف۔ **صنم خانے:** بت خانہ مراد منگول۔ **کشتیِ حق:** اسلام کی کشتی۔ **عصرِ نو:** نیا زمانہ۔ **بالا:** بلند رتبے والا۔ **دہر:** دنیا، زمانہ۔

مفہوم: تو خوشبو کی طرح پھول کی کلیوں میں قید ہے، یہاں سے نکل کر ہوا کے کندھوں پر سوار ہو اور ساری دنیا میں پھیل جا۔ تو ایک بے حیثیت ذرے سے صحرا کی طرح وسیع اور عظیم ہو جا۔ تو موج کی نرم رفتاری سے طوفان کا ہنگامہ بن جا۔ تو اللہ اور رسول ﷺ کی محبت اور اطاعت سے پستیوں کو بلندی میں بدل دے اور دنیا کو محمد ﷺ کے نام یعنی اسلام کے نور سے روشن کر دے۔

تشریح

(تعارفی عبارت ہر جزو کی تشریح سے پہلے لکھی جا سکتی ہے)

زیرِ نظر بند میں شاعر اللہ کی زبانی مسلمانوں کو نصیحت کر رہا ہے کہ وہ اللہ اور رسول ﷺ کی محبت اور اطاعت کی طاقت سے اپنی کمزوری، نااتفاقی اور سستی کو اپنی طاقت، وحدت اور سخت کوشی میں بدل دیں۔ اس بند سے پہلے اقبال نے اللہ کی زبانی مسلمانوں کو ان کی حقیقت سے آگاہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ جتنی بھی مشکلات اور مصیبتیں آج مسلمانوں پر ٹوٹ پڑی ہیں، یہ سب ان کے لیے امتحان ہے۔ مسلمانوں کی حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں برپا ہنگامے کو ابھی ان کی ضرورت ہے۔ وہ زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہیں۔ ان کی حرارت سے یہ زندگی قائم ہے۔ وہ دنیا میں اللہ کے نائب اور خلیفہ کے مقام پر فائز ہونے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ اس لیے انھیں بددل اور مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ انھیں اپنی ہمت، طاقت اور توانائیوں کو جمع کرنا چاہیے، کیوں کہ بقول اقبال:

وقتِ فرصت ہے کہاں، کام ابھی باقی ہے نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

(**نورِ توحید:** مراد اسلام۔ **اتمام:** پوری دنیا پر غالب آنا)

اس بند میں بھی شاعر اللہ کی زبانی مسلمانوں کو نصیحت کر رہا ہے کہ انھیں چاہیے کہ وہ اپنی کمزوریوں کو سمجھیں اور انھیں دور کرنے کی کوشش کریں۔ سب سے پہلے اقبال خوشبو کے غنچے میں قید ہونے سے مسلمانوں کے مختلف قوموں، گروہوں، قبیلوں، نسلوں اور وطنوں میں تقسیم ہیں۔ سب سے پہلے شاعر نصیحت کرتا ہے کہ مسلمانوں کو اس تقسیم کو ختم کر کے ایک ملت یا امت بن جانا چاہیے۔ اقبال کے خیال میں مسلمان مغربی اقوام کی طرح نہیں ہیں، جن کی بنیاد زبان، رنگ یا نسل پر رکھی جاتی ہے۔ بلکہ مسلمان ایک امت ہیں جس کی بنیاد عقیدہ توحید ہے۔ اس لیے انھیں چاہیے کہ

Geniusnesthub.com

CamScanner

وہ زبان، رنگ، نسل یا قوموں کی تقسیم چھوڑ کر ایک امت میں ڈھل جائیں۔ اقبال اس خیال کو کچھ یوں پیش کرتے ہیں:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاکِ کاشغر

(حرم: کعبہ مراد دینِ اسلام۔ پاسبانی: حفاظت۔ نیل کے ساحل: مصر میں ایک دریا۔ تا بہ خاکِ کاشغر: چین کے صوبہ سنکیانگ کے مرکزی شہر کاشغر کی مٹی تک، یہ علاقہ اسلامی تہذیب و تمدن کا بڑا زبردست مرکز رہا ہے)

پھر اقبال نصیحت کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ خوشبو کی مانند ہوا کے کندھوں پر سوار ہو جائیں اور پوری دنیا میں پھیل جائیں۔ یعنی اللہ کے پیغام کو لے کر وہ دنیا کے ہر کونے تک جائیں۔ جس طرح آپ ﷺ، خلفائے راشدین اور ان کے بعد آنے والے خلفا کے زمانے میں دعوت اور جہاد کے ذریعے مسلمان دنیا کے کونے کونے تک پہنچ گئے۔ وہاں نے توحید کے وہ چراغ روشن کیے جو آج تک جل رہے ہیں اور اپنی روشنی سے انسانیت کو راستہ دکھا رہے ہیں۔ پھر اقبال مسلمانوں میں جوش اور ولولہ پیدا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ آج وہ بے حیثیت اور کمزور ہیں۔ انھیں چاہیے کہ وہ اللہ کا نام لے کر اٹھیں اور حقیر ذرے سے عظیم الشان صحرا بن جائیں، نرم رفتار موجوں سے طوفان کی مانند طاقت ور بن جائیں۔

آخری دو مصرعوں میں اقبال ذلت اور پستی سے نکل کر پھر دنیا کی امامت کے مقام پر فائز ہونے کا اصول بیان کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنے آبا و اجداد کی طرف اللہ اور رسول ﷺ کی محبت اور اطاعت کی طاقت سے مضبوط ہونا پڑے گا۔ تبھی وہ ہر پستی کو بلندی میں بدل سکیں گے۔ وہ ذلت اور پستی سے ابھر کر عزت اور بلندی کے مقام پر فائز ہو سکیں گے۔ اس لیے انھیں چاہیے کہ وہ دنیا میں نبی کریم ﷺ کے پیغام کی روشنی کو لے نکلیں اور اس سے پوری دنیا کو روشن کر دیں۔

(۱۲)

ہر کوئی مستِ ذوقِ تن آسانی ہے
تم مسلماں ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے؟
حیدریؓ فقر ہے، نے دولتِ عثمانیؓ ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

لغت: مستِ ذوقِ تن آسانی: آرام طلبی اور سستی میں پڑا ہوا، غفلت میں گم۔ حیدریؓ فقر: حضرت علیؓ کی طرح دنیا سے بے نیاز رہنا۔ دولتِ عثمانیؓ: حضرت عثمانؓ جیسی دولت اور سخاوت۔ اسلاف: آبا و اجداد۔ نسبت روحانی: روحانی تعلق۔ خوار: ذلیل اور رسول۔ تارکِ قرآں: قرآن کو ترک کر کے یعنی چھوڑ کر۔

مفہوم: تمام مسلمان آرام طلبی اور سستی کی غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ کیا ان کا یہ انداز بطور مسلمان انھیں زیب دیتا ہے۔ ان میں حضرت علیؓ جیسا فقر اور حضرت عثمانؓ جیسی سخاوت دونوں ہی نظر نہیں آتیں۔ گویا انھیں اپنے بزرگوں سے کوئی روحانی تعلق نہیں رہا۔ ان کے آبا و اجداد مسلمان ہونے کی وجہ سے دنیا میں معزز تھے جب کہ یہ قرآن و سنت کو چھوڑ کر آج دنیا میں ذلیل اور رسوا ہو چکے ہیں۔

تشریح

(تعارفی عبارت ہر جز کی تشریح سے پہلے لکھی جا سکتی ہے)

زیرِ بحث بند میں اقبال اللہ کی زبانی مسلمانوں کے زوال کی تشخیص کرتے ہوئے ان کی کمزوریوں سے آگاہ کر رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آج کے مسلمان آرام طلبی اور سستی کا شکار ہو چکے ہیں۔ وہ دنیا کی محبت اور آسائشوں میں اتنا گم ہو چکے ہیں کہ انھیں اللہ کے دین کے لیے باہر نکلنا اور

کوشش کرنا مشکل لگتا ہے۔ ہر کوئی غفلت کی میٹھی نیند میں گم ہے اور اسی کو زندگی کا مقصد سمجھے ہوئے ہے۔ اسی لیے وہ لوگ [illegible] بطور مسلمان انھیں یہ انداز اور طور طریقے زیب دیتے ہیں، ہرگز نہیں۔ مسلمان تو وہ تھے جو مدینہ کی چھوٹی سی ریاست سے [illegible] حکمران بنے۔ وہ اللہ کی وحدانیت کا پیغام لے کر نکلے اور پوری دنیا میں خوشبو کی طرح پھیل گئے۔ انھوں نے دعوت اور جہاد کے [illegible] راستے میں آنے والی مشکلات اور مصائب کا بہادری اور جواں مردی سے مقابلہ کیا۔ وہ شہادت کی تمنا لے کر میدان میں اترتے [illegible] انھوں نے اس دعوت کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ یہ ان کی قربانیوں اور جدوجہد کا نتیجہ ہی تھا کہ آج اسلام کا پیغام دنیا کے کونے کونے میں پہنچ رہا ہے۔ لیکن ان کے برعکس آج کے مسلمان آرام طلبی کے عادی ہو چکے ہیں۔ وہ دنیا کی محبت میں اس قدر گم ہیں کہ انھیں اس بات کی خبر ہی نہیں ہے کہ وہ زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہیں۔ اسی لیے اقبال نے اسی نظم کے ایک اور بند میں طنز کرتے ہوئے کہا تھا:

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں! جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود

(وضع: انداز۔ نصاریٰ: عیسائی۔ تمدن: رہن سہن۔ ہنود: ہندو۔ یہود: یہودی)

اسی لیے اقبال افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ آج کے مسلمان تو اپنے بزرگوں کے اوصاف سے بھی محروم ہو چکے ہیں۔ ان کے بزرگوں میں حضرت علیؓ جیسے لوگ موجود تھے جو فقر میں بے مثل تھے۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے، دنیا کی محبت سے بے نیاز تھے۔ ان کی زندگی صرف اور صرف اللہ کی رضا کے لیے تھی۔ ان کا جہاد صرف اللہ کے راستے میں تھا۔ ان کے آباؤ اجداد میں حضرت عثمانؓ جیسے دولت مند بھی موجود ہیں۔ جو بے انتہا دولت مند ہونے کے باوجود سخاوت اور ایثار میں بے مثال تھے۔ ان کی دولت اللہ کی رضا اور اس کے راستے کے لیے تھی۔ اسی لیے اقبال افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آج کے مسلمانوں کو اپنے آباؤ اجداد سے کوئی روحانی تعلق باقی نہیں رہا کیوں کہ ان میں اپنے اجداد سے کوئی خوبی یا وصف باقی نہیں ہے۔ بقول اقبال:

قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمھیں پاس نہیں

(قلب: دل۔ سوز: تڑپ، جذبہ۔ پاس نہیں: خیال نہیں)

آخری دو مصرعوں میں اقبال اس مرض کی تشخیص واضح انداز میں کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تمھارے آباد دنیا میں اس لیے معزز تھے کہ وہ مسلمان تھے، وہ قرآن وسنت کے پیغام پر عمل کرنے والے اور اسے دنیا تک پہنچانے والے تھے۔ جب کہ آج کے مسلمان دین سے بچھڑ چکے ہیں، وہ قرآن وسنت کے پیغام کو ترک کر چکے ہیں۔ انھوں نے قرآن کو طاقوں میں سجا رکھا ہے۔ وہ بھول چکے ہیں کہ قرآن طاقوں میں سجانے کے لیے نہیں بلکہ دنیا میں نافذ ہونے کے لیے اُتارا گیا تھا۔ یہ وہ ضابطہ یا قانون ہے جسے اللہ نے دنیا میں ہدایت کے لیے بھیجا تھا لیکن افسوس آج ہم نے اسے بھلا دیا ہے۔

(۱۳)

عقل ہے تیری سپر، عشق ہے شمشیر تری
مرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تری
ماسوی اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری
تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

لغت:
سپر: ڈھال، پناہ۔ شمشیر: تلوار۔ خلافت: زمین پر اللہ کا نائب ہونا، اسلام کا سیاسی نظام۔ جہانگیر: پوری دنیا پر غالب ہونا۔ ماسوی اللہ

Geniusnesthub.com
CamScanner

کے: اللہ کے سوا، باطل قوتیں۔ تدبیر: کوشش، محنت۔ لوح و قلم: تختی اور قلم مراد تقدیر۔

مفہوم: اے مسلمان! عقل تیری ڈھال اور عشق تیری تلوار ہے۔ تیری خلافت ساری دنیا کے لیے ہے۔ تیری تکبیر باطل کے لیے آگ کی مانند ہے۔ اگر تو حقیقی مسلمان بن جائے تو تیری کوشش ہی تیری تقدیر بن جائے۔ اس کے لیے شرط یہ ہے کہ تو محمد ﷺ سے وفا کر، پھر یہ دنیا ہی نہیں تقدیر بھی تمھارے تابع ہو جائے گی۔

تشریح

(تعارفی عبارت ہر جز کی تشریح سے پہلے لکھی جا سکتی ہے)

زیرِ نظر بند نظم "جواب شکوہ" کا حاصلِ کلام ہے۔ اس بند سے پہلے اقبال نے اللہ کی زبانی شاعر کے شکوے کو جواب دیتے ہوئے مرض کی تشخیص کی تھی اور مسلمانوں کے زوال کی وجوہات گنوائی تھیں۔ انھیں بتایا تھا کہ وہ کون سی وجوہات ہیں جن کے سبب آج مسلمان حقیر اور ذلیل ہیں۔ وہ کون سے اوصاف ہیں جنھیں وہ ترک کر چکے ہیں اور اسی لیے دنیا میں پست ہیں۔ اس بند میں اقبال تشخیص کے بعد علاج تجویز کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اے مسلمان تیری عقل تیری ڈھال ہے۔ اس کے ذریعے تو کفر اور باطل کے ہتھکنڈوں سے اپنے آپ کو محفوظ کر۔ تو انھیں کی سازشوں اور چالاکیوں کو سمجھ کر ان کا توڑ کر۔ یہ عقل ہی ہے جو انسان کو حق اور باطل کی راہ میں فرق کرنے میں مددگار ہوتی ہے۔ پھر وہ مزید کہتے ہیں کہ تیرا عشق تیری تلوار ہے، جس سے تجھے اس دنیا میں باطل قوتوں کو مقابلہ کرنا ہے اور ان کے ظلم و ستم کا جواب دینا ہے۔ ظلم اور باطل کے مقابلے میں عدل قائم کرنا ہے جو اس دنیا کی تخلیق کا مقصد ہے۔ اسی کی طرف ایک دوسرے بند میں اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے ۔۔۔ دہر میں اسمِ محمد ﷺ سے اجالا کر دے

اقبال اللہ کی زبانی مسلمانوں کو پیغام دیتے ہیں کہ اس کی خلافت ہی اس دنیا کی حکمرانی ہے۔ خلافت سے مراد ایک تو اللہ کا نائب اور خلیفہ ہونا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرشتوں سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ وہ انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنائے گا۔ جس کا مطلب نائب ہونا یا نمائندہ ہونا ہے۔ انسان ہی مخلوق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اختیار اور تخلیقی قدرت کے ساتھ اس زمین پر اتارا ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد زمین پر اللہ کی بندگی کرنا اور اس کے بھیجے ہوئے پیغام کو دنیا کا قانون اور ضابطہ بنانا ہے تاکہ کل انسانیت اس قانون اور ضابطے کے تحت اللہ کی بندگی کو بحسن و کمال پورا کر سکے۔ خلافت سے مراد اسلام کا سیاسی نظام بھی ہے یعنی اسلام کو بطور ریاستی قانون اپنی اجتماعی زندگی پر لاگو کرنا۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ، خلفائے راشدین اور بعد میں آنے والے خلفا نے کیا۔ یہ سلسلہ ہجرت مدینہ سے لے کر ۱۹۲۴ تک خلافت کے خاتمے تک قائم رہا۔ اس خلافت میں مسلمان دنیا کی سب سے بڑی سیاسی، تہذیبی، سائنسی، علمی اور فوجی طاقت بن کر ابھرے۔

پھر اقبال مسلمانوں کو تکبیر یعنی توحید کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ ان کا عقیدہ توحید اس دنیا میں ہر باطل قوت اور خیال کے لیے اک آگ کی مانند ہے جو انھیں جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔ یہی وہ قوت ہے جو مسلمانوں کو باطل کے مقابلے پر ڈٹ جانے کی طاقت دیتی ہے۔ اسی لیے اقبال اللہ کی زبانی یہ پیغام دیتے ہیں کہ اگر مسلمان دوبارہ اپنی اسی بنیاد اور طاقت کی طرف متوجہ ہوں تو ان کی کوششیں ہی ان کی تقدیر بن جائیں گی۔ وہ جو کچھ بھی کریں گے، وہی دنیا کی تقدیر ٹھہری گی۔ اور آخر میں اقبال اپنی اس بات کو سمیٹتے ہوئے دو مصرعوں میں یوں بیان کرتے ہیں کہ اگر مسلمان محمد مصطفیٰ ﷺ کی وفا کریں، ان کی محبت کا حق ادا کریں۔ ان کی غیر مشروط اطاعت کریں تو صرف یہ دنیا ہی نہیں بلکہ لوح و قلم جو تقدیر الٰہی کی طرف اشارہ ہے، بھی ان کے ہم نوا ہو سکتے ہیں۔ گویا جب مسلمان مسلمان ہونے کا حق ادا کریں گے اور محمد ﷺ کی اطاعت کریں

CamScanner

گے تو ان کی تدبیر ہی ان کی تدبیر بن جائے گی۔ یہ خودی کی تکمیل کا وہ درجہ ہے جہاں پہنچ کر خدا بندے سے خود کہتا ہے کہ بتا تیری رضا کیا ہے۔ بقول اقبال:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے

مشق

سوال 1: نظم کے مطابق درج ذیل سوالوں کے جواب لکھیں۔

ا۔ علامہ اقبال کی یہ نظم کس ہیئت میں لکھی گئی ہے؟

جواب: اقبال کی نظم ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' دونوں ''مسدس'' کی ہیئت میں ہیں۔ مسدس ایسی نظم کو کہتے ہیں جس کے ہر بند میں چھ مصرعے ہوتے ہیں۔ عام طور پر یہ ہیئت طویل نظموں میں استعمال کی جاتی ہے۔ میر انیس کے مرثیے، نظیر اکبر آبادی کی بہت سی نظمیں اسی ہیئت میں ہیں۔

۲۔ ''شکوہ'' سن کر فرشتوں نے کن خیالات کا اظہار کیا؟

جواب: جب شاعر نے شکوہ کیا تو سب سے پہلے فرشتوں نے حیرت کا اظہار کیا کہ یہ آواز کس کی ہے۔ وہ سمجھ نہ سکے کہ یہ کون ہے جو اتنے دل دوز انداز میں فریاد کر رہا ہے۔ وہ اس بات پر بھی حیرت زدہ تھے کیا انسان کی پہنچ عرش تک بھی ہو چکی ہے۔ انھیں یہ انداز ادب کے خلاف لگ رہا تھا اور وہ اسے شوخی اور گستاخی سے تعبیر کر رہے تھے۔

۳۔ اس نظم میں موجود دور کے مسلمانوں کی کن کمزوریوں اور خامیوں کا ذکر ہے؟

جواب: اس نظم کے شاملِ نصاب حصے میں مسلمانوں کی جن کمزوریوں کو بیان کیا گیا ہے، وہ درجِ ذیل ہیں: شاعر کے مطابق مسلمان اب ہدایت کے طلب گار ہی نہیں رہے ہیں۔ وہ عقیدہ توحید کر چھوڑ کر لادینیت کی طرف مائل ہیں۔ پہلے وہ بت شکن تھے، اب وہ بت تراش ہیں۔ آج وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے کسی معجزے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اب ان میں جنت کے حصول کی تڑپ ناپید ہو چکی ہے۔ وہ اپنے بزرگوں کے برخلاف قرآن کو ترک کر چکے ہیں اور اسے لیے خوار ہیں۔

۴۔ اس نظم سے ایسے مصرعے چن کر لکھیں جن میں صنعتِ تلمیح کا استعمال ہو۔

جواب: اس نظم کے جن مصرعوں میں صنعت تلمیح استعمال ہوئی ہے، وہ درجِ ذیل ہیں:

مجھے جنت سے نکالا ہوا انساں سمجھا
آ گئی خاک میں چٹکی کو بھی پرواز ہے کیا
تھا جو مسجودِ ملائک، یہ وہی آدم ہے؟
کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں
بت شکن اُٹھ گئے، باقی جو رہے، بت گر ہے
تھا براہیم پدر اور پسر آزر ہیں
جلوہ طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں

Geniusneshub.com

CamScanner

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

حیدری فقر ہے، نے دولتِ عثمانی ہے
مرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تری

۵۔ اس نظم کا نام "جوابِ شکوہ" کیوں رکھا گیا ہے؟

جواب: اس سے پہلے اقبال ایک نظم "شکوہ" کے عنوان سے لکھ چکے تھے۔ جس میں انھوں نے مسلمانوں کی طرف سے اللہ سے شکوہ کیا تھا کہ اتنی قربانیوں کے باوجود آج مسلمان قوم ذلیل و رسوا ہے۔ پھر اس نظم کے جواب میں اقبال نے "جوابِ شکوہ" لکھی، جس میں اللہ کی طرف سے مسلمانوں کے زوال کے اصل اسباب بتائے گئے۔ چوں کہ یہ شکوہ کا جواب تھا، اس لیے اس کا عنوان "جوابِ شکوہ" رکھا گیا۔

۶۔ "بت بھی نئے" کی تشریح کریں۔

جواب: اقبال کی شاعری میں "بت" ایک استعارہ ہے۔ جو ان جدید تصورات یا چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، جنھیں مسلمانوں نے اللہ کے سوا پوجنا شروع کر دیا ہے۔ ان میں مغربی تہذیب اور اس کے تصورات سب نمایاں ہیں۔ اس کے علاوہ وطنیت پرستی اور فرقہ بندی بھی مراد ہے۔

۷۔ آخری بند میں کس چیز کو مسلمانوں کی شمشیر کہا گیا ہے؟

جواب: آخری بند میں اقبال نے عقل کو مسلمانوں کی ڈھال اور عشق کو مسلمانوں کی شمشیر کہا ہے۔ اور اس سے مراد ہے کہ مسلمان ان دو چیزوں کی مدد سے ہر باطل، اس کے پیروکاروں اور تصورات کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ عقل انسان کو حق اور باطل میں فرق کرنا سکھاتی ہے اور عشق انسان کو بے خطر حق کی راہ پر چلنے کا حوصلہ دیتا ہے۔

۸۔ امتی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسوائی کا کیسے باعث بنتے ہیں؟

جواب: جب ایک امت اپنے نبی کا راستہ چھوڑ کر غیر کے راستوں پر چل پڑے تو وہ اپنے نبی کی رسوائی کا باعث بنتی ہے۔ یہی حال مسلمانوں کا ہے کہ وہ آخری اور مکمل ہدایت لانے والے نبی کریم ﷺ کے راستے کو ترک کر کے مغربی تہذیب اور اس کے تصورات اپنا چکی ہے۔ اس لیے آج مسلمان امت اپنے پیغمبر کی نافرمانی کی وجہ سے ان کی رسوائی کی باعث ہے۔

۹۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کرنے کا کیا انعام ہے؟

جواب: اقبال کہتے ہیں کہ جس طرح مسلمانوں نے نبی کریم ﷺ کی محبت اور تقلید سے ایک ہزار سال تک دنیا پر حکمرانی کی ہے، اسی طرح آج بھی اگر وہ سب راستے چھوڑ کر دوبارہ سے محمد ﷺ سے محبت اور اطاعت کرے تو ان کی تدبیر، تقدیر میں بدل سکتی ہے۔ ان کی کوششوں اور دعاؤں کو اللہ کے ہاں پزیرائی مل سکتی ہے۔ اور وہ لوح و قلم یعنی تمام کائنات کی تقدیر کے مالک بھی بن سکتے ہیں۔

۱۰۔ دنیا میں کس کے نام کی برکت سے روشنی کرنے کی تلقین کی گئی ہے؟

جواب: دنیا میں صرف اور صرف رسول اللہ ﷺ کے نام سے برکت اور روشنی ہو سکتی ہے۔ جب اس نام کا پرچم بلند ہوتا ہے تو دنیا سے شرک، کفر، ظلم اور جہالت کے اندھیرے دور ہو جاتے ہیں۔ طاقت ور کمزور اور کمزور طاقت ور بن جاتے ہیں۔ اسی لیے اقبال کہتے ہیں کہ قوتِ عشق سے کام لے کر دنیا میں اسمِ محمد ﷺ سے اُجالا کیا جائے۔

Geniusnesthub.com

CS CamScanner

سوال ۲: درج ذیل الفاظ پر اعراب لگائیں۔

منفعت، مصلحت، رمضان، اسرار، سپر

سوال ۳: وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

کلام میں دو چیزوں کا ذکر کر کے دونوں کے درمیان فرق بتانے کو صنعتِ تفریق کہتے ہیں۔اس نظم میں کم از کم تین ایسے اشعار تلاش کر کے لکھیں، جن میں صنعتِ تفریق موجود ہو۔

تھے تو آبا وہ تمھارے ہی، مگر تم کیا ہو ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

بت شکن اُٹھ گئے، باقی جو رہے بت گر ہیں تھا براہیم پدر اور پسر آذر ہیں

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے پاسباں مل گئے، کعبے کو صنم خانے سے

سوال ۴: درست لفظ چن کر خالی جگہ پُر کریں۔

ا۔ "جوابِ شکوہ" دراصل اقبال کی ایک اور نظم ۔۔۔۔۔۔۔ کا جواب ہے۔ شکوہ

(ساقی نامہ، خضرِ راہ، شکوہ، طلوعِ اسلام)

ب۔ آئی آواز غم انگیز ہے ۔۔۔۔۔۔ تیرا (افسانہ، پیمانہ، دیوانہ، مے خانہ) افسانہ

ج۔ قدسی الاصل ہے ۔۔۔۔۔۔ یہ نظر رکھتی ہے۔ (دولت، ثروت، رفعت، قدرت) رفعت

د۔ بات کرنے کا سلیقہ نہیں ۔۔۔۔۔ کو (انسانوں، نادانوں، دیوانوں، حیوانوں) نادانوں

سوال ۵: اس نظم میں سے کم از کم دس ہم قافیہ الفاظ چن کر لکھیں۔

جواب: چالاک، بے باک۔ رضواں، انساں۔ زمیں، مکیں۔ انسانوں، نادانوں۔

ادا، خدا۔ شانِ کئی، نئی۔ خم، تم۔ کیا، فردا۔

سہارا، تارا۔ بالا، اُجالا۔ مسلماں، قرآں۔

سوال ۶: اس نظم میں جو فارسی تراکیب استعمال ہوئی ہیں ان میں سے کم از کم دس تراکیب لکھیں۔

جواب: طاقتِ پرواز۔ پیرِ گردوں۔ نالہء بے باک۔ دانائے رموزِ کم۔ اشکِ بے تاب۔ سکانِ زمین۔ طاقتِ گفتار۔ باعثِ رسوائی۔ عصرِ نو۔ منتظرِ فردا۔

اضافی مختصر سوال جواب

سوال ۱: بقول شاعر جو بات دل سے نکلے، اس کی تاثیر کیسی ہوتی ہے؟

جواب: شاعر کہتا ہے کہ جو بات دل سے نکلتی ہے، اس میں اثر ضرور ہوتا ہے۔ اس کے پر نہیں ہوتے لیکن اس میں پرواز کی طاقت ہوتی ہے۔ وہ فرشتوں کی طرح پاکیزہ ہوتی ہے اور اس کی نظر ہمیشہ بلندیوں پر ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ زمین سے اٹھتی ہے لیکن اس کی منزل آسمان ہوتا ہے۔

سوال ۲: شاعر کا شکوہ سن کر آسمان والوں میں کیا باتیں ہوئیں؟

جواب: شاعر کا شکوہ سن کر آسمان والوں میں چہ مگوئیاں شروع ہو گئیں۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ کون ہے، اس لیے ہر کوئی اندازے لگانے لگا۔ بوڑھے آسمان نے شاعر کی آواز سنی تو کہاں کہ یہ کوئی اہلِ آسمان میں سے ہے۔ سیارے کہنے لگے کہ یہ آسمان کے عرش کے اوپر موجود

Geniusnesthub.com

CamScanner

ہے۔ چاند نے کہا کہ یہ کوئی اہلِ زمین میں سے ہے۔ کہکشائیں نے اندازہ لگایا کہ یہ کوئی ایسا ہے جو آسمان ہی پر چھپا ہے۔ صرف جنت کے نگران نے درست اندازہ لگایا کہ یہ کوئی جنت سے نکالا ہوا انسان ہے۔

سوال ۳: شکوہ سن کر فرشتوں نے انداز کی شوخی کے متعلق کیا کہا؟

جواب: انھوں نے کہا کہ یہ تو اس قدر شوخ ہے کہ اللہ کے آگے بھی شکوہ کر رہا ہے۔ یہ وہی ہے جسے فرشتوں نے کبھی سجدہ کیا تھا۔ اگر چہ بے خودی کے عالم میں ہے اور بہت ہی کم رازوں سے واقف ہے لیکن اس میں عاجزی نام کو نہیں ہے۔ اسے اپنے بولنے کے انداز پر ناز ہے لیکن درحقیقت اسے بات کرنے کا سلیقہ نہیں ہے۔

سوال ۴: شاعر کے نزدیک اللہ تو مائل بہ کرم ہے لیکن مسلمان کس کمزوری کا شکار ہیں؟

جواب: شاعر اللہ کی زبانی جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ تو مائل بہ کرم ہے اور بھولے بھٹکوں کو راستہ دکھانا چاہتا ہے لیکن مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ وہ کرم کے طلب گار ہی نہیں، وہ ہدایت کی راہ پر چلنا ہی نہیں چاہتے۔ ان میں قابل لوگ نظر ہی نہیں آتے۔ ان میں ایسے اوصاف ہی نہیں جو انھیں انسان کے مقام پر فائز کر سکیں۔ اگر یہ لوگ قابل ہوتے تو اللہ بھی انھیں شان و شوکت عطا کرتا۔

سوال ۵: اس مصرع کی وضاحت کریں:

"تھا براہیم پدر اور پسر آزر ہیں"

جواب: اس مصرع کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے آبا و اجداد تو بت شکن تھے، وہ باطل کو مٹانے والے تھے، جیسا کہ ابراہیمؑ نے اپنے والد اور شہر والوں کی آنکھوں سے پردہ ہٹانے کے لیے بتوں کو توڑا تھا۔ جیسے محمود غزنوی نے ہندو راجاؤں کے غرور سومنات کو خاک میں ملایا تھا۔ لیکن آج کے مسلمان ابراہیمؑ کے پیروکار نہیں بلکہ آزر کے نقش قدم پر چلنے والے ہیں جو بت بنانے والا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے مسلمانوں نے سو طرح کے بت تراش رکھے ہیں۔

سوال ۶: الحاد سے دل خوگر ہیں، سے کیا مراد ہے؟

جواب: اس کا لفظی مطلب ہے کہ مسلمان اللہ کے انکار کی طرف راغب ہیں۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ پچھلی دو صدیوں میں مغربی تہذیب دنیا پر غالب آچکی ہے۔ اس تہذیب کی اول بنیاد سیکولرازم تھی جس میں خدا کو دنیاوی زندگی سے نکال کر صرف عبادت گاہوں تک محدود کر دیا گیا۔ اسی تہذیب سے پھر لبرل ازم کے زہریلے پھول پیدا ہوئے جنھوں نے مادر پدر آزادی کو ہوا دی۔ اسی مادر پدر آزادی کی آخری منزل الحاد ہے یعنی انسان اس قدر آزادی کے فریب میں مبتلا ہو جائے کہ وہ اللہ کا انکار کر بیٹھے۔ یہی اقبال کہ رہے ہیں کہ مسلمان بھی سیکولرازم اور لبرل ازم کے فریب میں آ کر اب الحاد کی طرف راغب ہیں۔

سوال ۷: بقول شاعر آج کے مسلمان اپنے آبا سے کس طرح مختلف ہیں؟

جواب: شاعر کہتا ہے کہ آج کے مسلمانوں کے آبا دنیا سے باطل کو مٹانے والے تھے، وہ انسان کو شرک اور جہالت کی غلامی سے نکالنے والے تھے، وہ کعبے کو اپنی پیشانیوں سے سجانے والے تھے اور اللہ کے قرآن کو سینوں سے لگانے والے تھے لیکن آج کے مسلمان ان تمام اوصاف سے محروم ہیں اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے کل کا انتظار کر رہے ہیں کہ کوئی آئے گا اور ان کی حالت بدلے گا۔

سوال ۸: یورشِ تاتار کے افسانے سے کیا عیاں ہے؟

جواب: شاعر کہتا ہے کہ تاتار یعنی منگولوں کی تباہی و بربادی کے افسانے سے یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو ظالموں سے بھی اپنے دین کی

Geniusnesthub.com
CamScanner

حفاظت کا کام لے لیا کرتا ہے۔ یہی منگول تھے جنھوں نے مسلم دنیا کو تباہ و برباد کر دیا لیکن یہی مسلمان ہوئے تو اللہ کے دین کی حفاظت کرنے والے بن گئے۔ اس لیے شاعر مسلمانوں کو کہتا ہے کہ وہ وقتی بربادی اور شکست سے افسردہ نہ ہوں بلکہ پورے ایمان کے ساتھ میدان عمل میں اتریں۔

سوال ۹: دہر میں اسم محمد ﷺ سے اجالا کرنے سے کیا مراد ہے؟

جواب: اس کا مطلب ہے کہ مسلمان دنیا میں اللہ کے دین کا پرچم بلند کریں۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر جو دین نازل کیا ہے، یہ مکمل ضابطہ حیات ہے۔ یہ قیامت تک ہر دور کے لیے قانون ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ محمد ﷺ کے اس دین کا پرچم دنیا پر غالب کریں اور ان کے لائے ہوئے قانون کو دنیا پر نافذ کریں تا کہ دنیا دینِ محمدی ﷺ کی روشنی سے بالکل ویسے ہی فیض یاب ہو سکے جیسے پہلے ہوئی تھی۔

سوال ۱۰: آج کے مسلمان زمانے میں کیوں خوار ہیں؟

جواب: اقبال اپنے ایک شعر میں آج کے مسلمانوں اور ان کے آبا کا موازنہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ان کے آبا زمانے میں اس لیے معزز تھے کیوں کہ وہ مسلمان تھے، وہ قرآن وسنت پر عمل کرنے والے اور دینِ محمدی ﷺ کا پرچم بلند کرنے والے تھے۔ لیکن اس کے برعکس آج کے مسلمان تارکِ قرآن ہو چکے ہیں۔ انھوں نے قرآن کو اپنی عملی زندگیوں سے خیر باد کہہ دیا ہے اور اسے غلافوں میں لپیٹ کر طاقوں میں سجا چھوڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آج زمانے میں خوار ہیں۔

سوال ۱۱: اس نظم کی ہیئت کیا ہے؟

جواب: اس نظم کی ہیئت مسدس ہے جس کے ہر بند میں چھ مصرع ہوتے ہیں۔ عموماً اس کے پہلے چار مصرع ہم قافیہ اور آخری دو مصرع ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ اس نظم میں بھی یہی ترتیب موجود ہے۔ اقبال کی دونوں نظمیں ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' مسدس ہی کی ہیئت میں ہیں۔ یہ ہیئت زیادہ تر طویل نظموں میں استعمال کی جاتی رہی ہے۔

اضافی کثیر الانتخابی سوالات

☆ ہر سوال کے چار ممکنہ جوابات (ا، ب، ج، د) دیئے گئے ہیں، درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیں۔

1- علامہ محمد اقبال کا سن پیدائش ہے؟

ا۔ ۱۸۷۷ ب۔ ۱۸۷۸ ج۔ ۱۸۷۹ د۔ ۱۸۸۰

2- علامہ محمد اقبال کا سن وفات ہے؟

ا۔ ۱۹۳۵ ب۔ ۱۹۳۶ ج۔ ۱۹۳۷ د۔ ۱۹۳۸

3- ان کے والد کا نام تھا؟

ا۔ نور دین ب۔ شیخ نور محمد ج۔ چودھری نور محمد د۔ نور خان

4- اقبال کی ابتدائی تعلیم کہاں سے ہوئی؟

ا۔ سکول ب۔ گھر میں ج۔ مدرسے د۔ کہیں نہیں

Geniusneshub.com

5- مدرسے میں انھیں کون سے قابل استاد میسر آئے؟
ا۔ سر آرنلڈ ب۔ سید میر حسن ج۔ شبلی نعمانی د۔ اکبرالہ آبادی

6- اقبال کو عربی اور فارسی کا صحیح ذوق کس کی بدولت میسر آیا؟
ا۔ سر آرنلڈ ب۔ سید میر حسن ج۔ شبلی نعمانی د۔ اکبرالہ آبادی

7- اقبال نے ایف اے کرنے کے بعد کہاں داخلہ لیا؟
ا۔ مرے کالج سیالکوٹ ب۔ اسلامیہ کالج لاہور ج۔ دلی کالج د۔ گورنمنٹ کالج لاہور

8- گورنمنٹ کالج میں انھیں کون سے شفیق استاد ملے؟
ا۔ سر آرنلڈ ب۔ سید میر حسن ج۔ شبلی نعمانی د۔ اکبرالہ آبادی

9- ایم اے کرنے کے بعد اقبال اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے کہاں چلے گئے؟
ا۔ کراچی ب۔ ملتان ج۔ دہلی د۔ یورپ

10- جب مسلم لیگ کی صدارت کے لیے اقبال کا نام تجویز ہوا تو انھوں نے کس کو اس منصب کا اہل قرار دیا؟
ا۔ محمد علی جوہر کو ب۔ قائداعظم کو ج۔ ظفر علی خان کو د۔ عبدالرب نشتر کو

11- انھوں نے پاکستان کی تجویز کہاں ہونے والے مسلم لیگ کے سالانہ جلسے میں دی؟
ا۔ لاہور ب۔ دہلی ج۔ الہ آباد د۔ حیدرآباد

12- کہاں کے دورے کے بعد صحیح معنوں میں اقبال کی شاعری کے موضوعات کا تعین ہو گیا تھا؟
ا۔ لاہور ب۔ یورپ ج۔ افغانستان د۔ امریکہ

13- انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے کس چیز کا پیغام دیا؟
ا۔ خودنمائی کا ب۔ محبت ج۔ غرور د۔ حرکت و عمل

14- اقبال کا کون سا فلسفہ مسلمانوں کے لیے مشعل راہ بن گیا؟
ا۔ فلسفہ عمل ب۔ فلسفہ خودی ج۔ فلسفہ علم د۔ فلسفہ حرکت

15- ان کی بے پناہ شاعرانہ خصوصیات کے باعث قوم نے انھیں کون کون سے القاب دیے؟
ا۔ شاعرِ مشرق ب۔ حکیم الامت ج۔ نباضِ فطرت د۔ ا، ب، ج تینوں

16- اقبال کے آفاقی نظریات زیادہ تر کس زبان کی شاعری میں موجود ہیں؟
ا۔ فارسی ب۔ اُردو ج۔ عربی د۔ انگریزی

17- نظم "جوابِ شکوہ" کس ہیئت میں ہے؟
ا۔ مثلث ب۔ مربع ج۔ مخمس د۔ مسدس

18- مسدس ایسی نظم کو کہتے ہیں، جس کے ہر بند میں ۔۔۔۔۔ مصرعے ہوتے ہیں؟
ا۔ تین ب۔ چار ج۔ پانچ د۔ چھ

Geniusnesthub.com

CamScanner

-19 نظم "جوابِ شکوہ" کس نظم کا جواب ہے؟

ا۔ شکوہ ب۔ طلوعِ اسلام ج۔ شمع اور شاعر د۔ خضرِ راہ

-20 ان میں کون سی تصنیف اقبال کی ہے؟

ا۔ بانگِ درا ب۔ بالِ جبریل ج۔ ضربِ کلیم د۔ ا، ب، ج تینوں

-21 ان میں کون سی تصنیف اقبال کی ہے؟

ا۔ ارمغانِ حجاز ب۔ زبورِ عجم ج۔ جاوید نامہ د۔ ا، ب، ج تینوں

-22 ان میں کون سی تصنیف اقبال کی ہے؟

ا۔ اسرارِ خودی ب۔ رموزِ بے خودی ج۔ پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق د۔ ا، ب، ج تینوں

-23 ان میں کون سی تصنیف اقبال کی ہے؟

ا۔ مسافر ب۔ پیامِ مشرق ج۔ علم الاقتصاد (نثر) د۔ ا، ب، ج تینوں

جوابات

-1	ا	-2	د	-3	ب	-4	ج	-5	ب
-6	ب	-7	د	-8	ا	-9	د	-10	ب
-11	ج	-12	ب	-13	د	-14	ب	-15	د
-16	ا	-17	د	-18	د	-19	ا	-20	د
-21	د	-22	د	-23	د				

Geniusnesthub.com

CS CamScanner